حرف و سخن
HARF-O-SUKHAN
Urdu Research Journal of PAKISTAN
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.3 2023

Superstition in Urdu literature of KPK

کے پی کے اردو افسانہ میں توہم پرستی

Dr. Anwar Ali
Assistant Professor
Deptt Urdu
Islamia College, Peshawar
Dr. Roohul Amin
Lecturer, Deptt Urdu
Cadet College Swat
Dr Ajmal Khanant
Assistant professor, Deptt Urdu
University of Swat

ABSTRACT:
From dark ages to era of enlightment, superstitions have been a mandatory part of every culture, religion and creed.
This study analyzes the causes of the different styles and productions of the given writers. It presents an evaluative study of the fictions of all those translators who depicted the reflections of the rusticity of Khyber Pakhtunkhwa in their translations. It employed a documentary analytical procedure and sorted out libraries and other modern sources for the collection of thematic data. It aims at exploring the rustic elements and their representations in the fiction genre of the selected writers in Khyber Pakhtunkhwa.

KEYWORDS:
Culture, Translators, Sources, Elements, Rustic, Fiction,Collection, Productions, Reflections,

(ت)۔توہم پرستی:

توہم اپنی موہوم صورت میں سہی لیکن انسان کی زندگی میں امید و بیم کی تخم ریزی کرکے وہم و خیال کے مرغزار ضرور اُگاتا ہے اور زندگی کو کبھی خوش گوار اور کبھی سو گوار بنا کر جینے کے رستے دکھاتا ہے۔اسی توہم کے نقطے سے روانہ ہو کر شک و گمان سے ہوتے ہوئے یقین و ایمان کی سرحد پر پہنچاتا ہے۔پشتون قوم اور تہذیب کی قدامت کے ساتھ ساتھ یہاں کے باسیوں میں روایتاً توہمات اب بھی موجود ہے۔جدّت زمانہ کے ساتھ توہمات کا بتدریج ختم ہونا تو بنتا ہے لیکن بد قسمتی سے بعض توہمات اس قدر رچ بس چکے ہیں کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہیں۔ یہاں کی دیہی معاشرت میں توہمات اور اعتقادات کی ایک نرالی دنیا آباد ہے۔اور بنظر غائر مشاہدہ کرنے سے اعتقادات و توہمات کی بھرمار نظر آتی ہیں۔ نظر لگنا اور پیر فقیروں کو مختلف نوعیت کے مرادوں کیلئے خاص کرنا مثلاً اولاد نرینہ کیلئے ایک مزار تو پاگلوں اور دیوانوں کیلئے دوسرا، بانجھ پن کیلئے پیر بابا تو جنوں کو بھگانے کیلئے سیدو بابا اسطرح تعویذ اور کالے جادو کے خاتمے کیلئے باڑئی بابا وغیرہ اس پر بس نہیں جانوروں اور پرندوں میں بھی منحوس و متبرک کی درجہ بندی کی گئی ہے۔الّو منحوس تو ابابیل متبرک، مکڑی اور چھپکلی کا مار گرانا گناہ، گھریلوں خرگوش، طوطا اور مینا کا گوشت کھانے سے اجتناب۔زیادہ بارشوں کو ناجائز اولاد جننے اور قتل ناحق کی وجہ گردانتے ہیں۔ یہاں تک کہ اسلامی مہینوں میں سفر کے مہینے کو جنّات کا سایہ پڑنے کی وجہ سے منحوس خیال کیا جاتا ہے یہاں کے افسانہ نگاروں نے دیہی ثقافت میں رواج پذیر انہی توہمات کو اپنے افسانوں میں مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔پشتون معاشرت میں کسی لڑکی کا جوانی میں بیوہ ہونا بھی لڑکی کی نحوست سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بیوہ ہونے پر اس سے ہتک امیز رویہ روا رکھا جاتا ہے۔ سید راحت زاخیلی کے افسانے ”کنواری بیوہ“میں اسی طرح توہم پر مبنی کہانی بیان ہوئی ہے۔جب سترہ سالہ مرغے کا شوہر انتقال کر جاتا ہے تو سسرال والے مرغے کو منحوس جان کر اس پر طرح طرح کے مظالم ڈھاتے ہیں۔بناو سنگھار تو دور کی بات دو سال تک میکے کا منہ نہ دیکھنے والی مرغے بالوں میں کنگھی تک نہیں کر سکتی۔ نحوست کا الزام لئے معصوم مرغے جب دو سال بعد بھائی کے شادی پر میکے جاتی ہے تو وہاں بھی اس کو اسی قسم کے صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔راحت نے اس منظر کو کچھ اس طرح پیش کیا ہے:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

> "وہ ماں جس نے دودھ پلا کر پالا پوسا تھا۔اسی نے اسے منحوس جانا خدا کا کرنا کیا باپ کا یہاں سے گزر ہوا اسے کسی نے بتایا تو اس نے ترس کھا کر کہا" کوئی بات نہیں بچاری سے غلطی ہو گئی ہے۔" تب مرغے کا قصور معاف ہوا۔۔۔۔۔۔جانے کب تک وہ یونہی روتی رہی مگر کسی نے اسے پوچھا تک نہیں۔" (1)

افسانہ نگار نے مرغے کے صورت میں پشتون معاشرت کے ان گنت بہو بیٹوں کا مقدمہ قارئین کے عدالت میں پیش کیا ہے۔اور توہم کے زیر اثر معاشرتی زبوں حالی، گھٹن، ناانصافی اور اس کے نتیجے میں معصوم کلیوں کی ترستی، کُڑھتی اور اذیت ناک جیون کی جھلک دکھائی ہے۔اسی توہم کی وجہ سے کئی خاندان اور گھرانوں کی زندگیاں تباہ اور معصوم بیٹیاں مرغے کی طرح خودکشیوں پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

فہمیدہ اختر نے اپنے افسانے "جلتے ہوئے دیئے"میں پشتون قبائل اور بالخصوص خواتین کی ضعیف الاعتقادی کو موضوع بنایا ہے۔ جس دن ماہ رُخ کی نوکرانی گل پروشہ کی منگنی مصروبو کے بیٹے خان گل سے طے ہوتی ہے۔اسی مہینے خان گل کا چچا فوت جبکہ اس کی چھوٹی بہن تیز بخار کا شکار ہو جاتی ہے جس کو گل پروشہ کی نحوست پر منتج کیا جاتا ہے۔ماہ رُخ کے جلتے دیئے ندی میں چھوڑنے پر مصروبو جب اس کو دیکھتی ہے تو اس کو قیامت کی نشانی بتلاتی ہے۔ جبکہ ماہ رُخ اس کو مزاق بنا کر کہتی ہے کہ اس سال آپ کے گھر ڈھیر سارا غلّہ جمع ہوگا۔اتفاقاً ایسا ہو جاتا ہے اور یوں مصروبو کی جلتے دیوں پر یقین پختہ ہو جاتا ہے۔ماہ رخ کو یقین ہو جانے پر کہ گل پروشہ کے ساس واقعی ان کو منحوس سمجھتی ہے تو ان کو اس مصیبت سے چٹکارا دلانے کیلئے گل پروشہ کی شادی کے دنوں پھر ندی میں جلتے دئے چھوڑ دیتی ہے یوں مصروبو کو گل پروشہ منحوس نہیں بلکہ بھاگو بھری معلوم ہونے لگتی ہے۔ ضعیف الاعتقادی کا فائدہ اُٹھا کر ماہ رخ گل پروشہ کی زندگی سنوار دیتی ہے۔

منور روف نے اپنے افسانے "یادوں کے دیپ"میں معاشرتی توہم پرستی کو موضوع بنایا ہے۔توہم اس معاشرے میں اس قدر ہے کہ والدین بھی اس کا شکار ہو کر بچوں میں بھی منحوس و بختاور کی تفریق کرکے جداگانہ سلوک و رویّہ رکھتے ہیں۔اس افسانے میں دو بہنوں دلکش اور دلفریب کے ساتھ بھی والدین کا اس قسم کا رویّہ ہوتا ہے۔دلکش کے پیدائش پر اُن کے والد کا کاروبار اتفاقاً نقصان کر جاتا ہے اور ساتھ ہی والدہ بھی شدید بیمار پڑ جاتی ہے۔ان اتفاقات کو دلکش کے پیدائش سے منسوب کرکے ان کو منحوس گردانہ جاتا ہے۔ جبکہ اس کے برعکس دلفریب کو خوش بخت و بختاور سمجھا جانے لگتا ہے۔ بالآخر نفرت و تذلیل کے رویّہ سے دل برداشتہ دلکش اپنی زندگی کا خاتمہ کر بیھٹتی ہے۔افسانہ نگار نے اس افسانے میں معاشرتی ضعیف الاعتقادی کی وجہ سے معصوم زندگیوں کو اس کا شکار ہوتے ہوئے معاشرتی المیوں کو بیان کیا ہے۔ نحوست و خوش بختی کے ایسے ہی رویّے کو افسانہ "کِرم خورہ مستون"میں بھی دکھایا گیا ہے۔اور ان توہم پرستانہ رویّوں سے جنم لینے والے واقعات اور برباد ہوتے زندگیوں اور خاندانوں کو آشکار کیا گیا ہے۔

زیتون بانو پشتون تہذیب و ثقافت اور بالخصوص خانگی زندگی کے ایک نبض شان افسانہ نگار ہے۔انہوں نے اپنے افسانوں میں اپنے مشاہدات و تجربات کو سمو کر اس کو پشتون معاشرت میں موجود خانگی مسائل ،اعتقادات و نظریات اور رسوم و رواج کو بہترین و دلفریب انداز میں قاری کیلئے پیش کیا ہے۔افسانہ "بختاور"میں زیتون نے پشتون معاشرے کے ایک ایسی ہی توہمانہ خیالات کے ساس بہو کی کہانی بیان کی ہے۔ بہو بیاہ کر لانے پر اتفاقاً گھر میں خوشحالی اور سسر کی محکمانہ ترقی کو بہوں کی خوش بختی جان کر ان کو بختاور کے لقب سے نوازا جاتا ہے۔نیک پروین بہو کی نہ صرف گھر میں بلکہ سارے خاندان میں بختاوری کے چرچے ہونے لگتے ہیں۔ہر خاص و عام خوشی کے مواقع پر "بختاور" کے رائے کو اہمیت و فوقیت دی جانے لگی۔خاندان بھر میں شادیوں کے موقع پر دلہا دلہن کے سہرے "بختاور کے ہاتھوں باندھنا خوش بختی سمجھی جاتی۔لیکن بختاور کے اچانک فوت ہو جانے والے شوہر کے وجہ سے اب معاملہ اُلٹ ہوگیا۔بختاور اب خوش بخت و نیک بخت ہونے کے بجائے منحوس و بدبخت شمار ہونے لگی اور یہاں تک کہ دیور کے شادی پر ساس کا ان کے ساتھ رویّہ افسانہ نگار نے یوں بیان کیا ہے:

> "وہ دوسری عورتوں کے ساتھ جانے کے لیے تیار کھڑی تھی جب عورتیں ایک ایک کرکے چلی گئیں تو ساس نے آکر اس سے کہا کہ گھر کا دھیان رکھنا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہم ابھی واپس آتے ہیں۔ساس کی یہ بات اس پر ناگہانی بجلی کی طرح گری وہ پتھر کے بت کی طرح کھڑی رہ گئی جیسے کسی نے اس کی روح سلب کرلیا ہو۔ساس نے گھر سے جاتے جاتے اس کی طرف منہ کرکے ایک بار پھر کہا۔"اے۔۔۔۔۔دیکھتی ہو جب ڈولی گھر میں آئے تو دلہن کے سامنے ہرگز نہ آنا۔" (2)

افسانہ نگار نے پشتون معاشرت میں سرایّت کرتی توہم پرستی اور عورت ذات کے ظالم و مظلومیت کو بیان کیا ہے۔اس معاشرت میں بدقسمتی سے بچی پیدا ہوتی ہی بدبختی کی کسوٹی پر کسی جاتی ہے۔ پسماندہ علاقوں میں بیٹی کی آمد سے رفت گزشت تک یا تو نیک پروین یا بدشگونی کے تھپیڑے سہ سہ کر اپنی شناخت و عزت نفس کھو جاتی ہے۔ بابل کے گھر میں والدین اور بھائیوں کے آنکھوں میں محبت ڈھونڈتی ہے لیکن سسرال میں جا کر ہر آنے والا لمحہ اس کے تقدیر سے وابستہ کیا جاتا ہے۔

مشرف مبشر نے اپنے افسانے "روگ"میں توہم پر مبنی ایسی نفسیاتی ماحول کا تذکرہ کیا ہے۔ گھٹن، تعصب، جبر و تشدد، نفسیاتی الجھن اور تنگ نظری پر مبنی اس معاشرے میں عورت ذات کی حیثیت ان کے ساتھ روا رکھا گیا ظالمانہ وغیرہ اخلاقی رویّہ تو چلّو سسرال میں بہ امر مجبوری قابل برداشت ہے۔ لیکن بابل کے یہاں بھی اس طرح کے سلوک و رویّے کا سامنا ہو تو مرنے کے سوا چارہ نہیں۔ افسانہ نگار نے ایک طلاق یافتہ عورت کی بیٹی کے زباں کہانی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ والد

کے دوسری شادی کرنے پر ہم گھر کے بالائی منزل میں رہنے لگے لیکن والدہ کے طلاق پر ہم چاروناچار ننھیال منتقل ہوگئے ماموں نے بہت آو بھگت کی ہمارا اچھے طرح سے خیال رکھا لیکن میرا کلیجہ کٹ کے رہ گیا جب میری شادی پر اپنی اس ماں کو اکیلا چھوڑ رہی تھی جنھوں نے اپنے جوانی میرے لیے بتادی اور مجھے بن باپ کے پالا پوسا۔

"اس ماں کا درد سمجھنے والا کوئی دل سوز نہ تھا جس نے اپنی جوانی کا رس نچوڑ کر ایک بن باپ کی بچی کو توانا اور مضبوط بنا دیا تھا مگر خود شاخ بریدہ اور برگ زرد کے مانند ایک بار پھر باد مخالف کے جھونکے سہنے کو تن تنہا ویران راہوں پر کھڑی تھی۔" (3)

افسانہ نگار نے پشتون معاشرت کے اس المیاتی حقیقت کو اُجاگر کیا ہے، کہ یہاں اگرچہ بہنوں بیٹیوں کو والدین کے گھر عزت وتوقیر سے بخشا تو جاتا ہے ،لیکن اس ذہنیت کا کیا کیا جائے جو طلاق اور بیوگی کی نحوست گردانی پر مبنی ہے۔اور ان کو بدبخت اور منحوس جانا جاتا ہے۔ڈاکٹر پروین عظیم کے افسانہ ''پاپی'' کا گل محمد اور مس ثروت وہاب کے افسانہ ''بند گلی'' کا علی بھی اسلئے منحوس اور بدبخت ہے کہ اس نے پیدا ہوتے ہی والدین کو کھالیا۔پشتون معاشرے کے اسی روئے کو افسانہ نگار نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

'' وہ بچہ مجھے دوست سمجھتا تھا۔اور دل کی ہر بات مجھ سے کیا کرتا تھا۔ میری بات پر وہ تھوڑی دیر تک سر جھکائے خاموشی سے کھڑا رہا اور پھر بہت دکھ سے بولا "میڈم کیا میں گندہ بچہ ہوں؟اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے ۔۔۔۔۔۔۔ چچی کہتی ہے کہ میں منحوس بچہ ہوں۔ میری وجہ سے بابا اور اماں اللہ میاں کے پاس چلے گئے۔(4)

بجائے اس کے کہ عزیز و اقارب اس کے سرپر دست شفقت رکھتے ،ان سے مشفقانہ رویہ اور محبت کا سلوک رکھتے، نفسیاتی الجھنوں کا شکار اس معاشرے میں اس طرح کے کردار آگے چل کر خود اس معاشرہ کیلئے دردسر بن جاتے ہیں۔اور معاشرتی رویّوں سے گندہ ہونے والی یہ مچھلی پھر سارے معاشرت کو گندہ کر دیتی ہے ۔دہشت ولاقانونیت کا دور ودورہ ایسی ہی کرداروں کے بدولت جنم لیتا ہے جو کہ دراصل اسی معاشرے کی پیدا کردہ ہوتے ہیں۔

افسانہ ''حوالدار فقیر خان ''میں افسانہ نگار نے لوگوں کے اعتقادات اور توہمات کو واضح کرتے ہوئے بعض لوگوں کو فقیر خان کی گمشدگی پر یہ کہتے دکھایا ہے کہ "جنگلات میں جنّوں نے اسے قید کر لیا ہوگا " ۔جانوروں اور پرندوں کے خاص اوقات میں آوازیں دینے کو بھی یہاں کے سادہ لوح باسیوں نے زندگی میں پیش آنے والے واقعات سے جوڑ رکھا ہے۔مفلس درانی کے افسانے "بیٹا دو روپے کا" میں گاؤں کے ایک قبرستان میں پرانے درخت کو جنوں اور بھوتوں سے منسوب کر رکھا ہے افسانہ نگار اس توہم پرستی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''اگلے روز جب لوگ نماز کے لیے عیدگاہ جارہے تھے تو راستے میں کٹو بابا کے مقبرے میں انہیں جنات والے توت کے ساتھ کوئی چیز لٹکتی نظر آئی۔اور جب لوگ اس کے نزدیک پہنچے تو کسی کی آواز آئی۔"اوہ یہ تو عملی خان ہے۔یہ کیوں لیکن کسی کے پاس ان کا جواب نہ تھا۔" (5)

خیبر پختون خوا کے دیہی علاقہ جات میں تعلیمی شرح بہت کم ہے۔غربت و بے روزگاری اور تعلیمی سہولیات کا فقدان اس کی اہم وجوہات ہے۔علمی ومالی پسماندگی کی وجہ سے بچوں کی تربیت کماحقہ ہونے سے رہ جاتی ہے۔اور یوں نسل در نسل چلی اس پسماندگی کی وجہ سے معاشرہ نفسیاتی الجھنوں اور ذہنی عوارض کا شکار ہو کر دوسرے ترقیافتہ ملکوں وعلاقوں کے ہم پلہ ہونے سے رہ جاتا ہے۔اور اسی بنا بے بنیاد مذہبی عقائد کا شکار ہو کر اپنے مسائل کے حل کے تلاش میں پیروفقیروں، مزارات ، تعویز گنڈ اور ٹونوں ٹوٹکوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ خیبر پختون خوا کے دیہی علاقوں میں یہ رجحان زیادہ پایا جاتا ہے۔اور انہی علاقوں کے لوگ اس طرح کے عوارض کا زیادہ شکار ہیں۔معاشرے میں موجود ضعیف الاعتقادی کو یہاں کے افسانہ نگاروں نے اجاگر کیا ہیں۔رضا ہمدانی اپنے افسانے ''غوبل ''میں اسی قسم کے عقائد رکھنے والے کسانوں کا ذکر کیا ہے، کہ یہ لوگ اللہ کے ذات کو مشکل کشا جان کر پیر و فقیر کو اس کا وسیلہ گردانتے ہیں اور مزارات پر جا کر منتیں مانگتے ہیں۔کسان بھی اپنے اچھے فصل کو پیر بابا کے برکات ہی کا طفیل سمجھتے ہیں۔''اللہ کے فضل اور پیر بابا کے برکت سے اب کے فصل خوب ہوئی ہے۔''اسطرح جب گاؤں کے کسان خان کے ظلم کے جواب میں اکھٹے ہوتے ہیں تو افسانہ نگار ان کے عزائم کا اظہار یوں کرتا ہے:

''گلاب کاکا گرج رہا تھا۔اس کے آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔اور وہ بے خودی کے عالم مین افق کو دیکھ رہا تھا وہ ایک دم "یا پیر بابا" کہہ کر اٹھا اب اس کی انکھوں میں چمک تھی خوشی کی چمک ،خوشحالی کی چمک۔''(6)

افسانہ نگار نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ اس معاشرے میں پیر و فقیر کو خاص وسیلہ وسبب مانا جاتا ہے۔اور ہر کوئی اپنے روزمرہ زندگی میں انہی کے برکات وعنایات کا قائل ہے۔دراصل یہ معاشرتی ذہنیت کی کارستانی ہے کہ علم کی فقدان کی وجہ سے برسوں سے روایت پزیر عقائد کا ماننا اور اس کی پیروی کرنا مجبوری بن جاتی ہے۔جبکہ بعض اوقات کسی پیر فقیر کی پیش کردہ پیشن گوئی اتفاقاً سچ ثابت ہو جاتی ہے اور یوں آن کی آن میں وہ مشہور ومقبول ہو جاتا ہے۔لوگ جوق در جوق اس کے استانے پر حاضری دینے لگتے ہیں۔اور تعویز گنڈوں اور دم چھپ کا سلسلہ شروع ہو کر اکثر و بیشتر جاہل وان پڑھ فقیر معجزات و کرامات کا مالک بن جاتا ہے۔

حرف و سخن HARF-O-SUKHAN Urdu Research Journal of PAKISTAN
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

قتیل شفائی کے افسانہ "خوبانی" میں پشتون معاشرے میں روایت پذیر اس روئے کو پیش کیا گیا ہے۔افسانہ نگار نے معاشرے میں عام وقوع پذیر ہونے والے واقعات کو یہاں کے اعتقادات کا حصہ بنتے دکھایا ہے۔اس افسانے میں نوروز نام کا ایک کردار پیش کیا گیا ہے۔وہ ایک متوکل، بااخلاق، زاہد، پارسا اور نیک بندہ ہوتا ہے۔وہ یہ کوشش کرتا ہے کہ اس سے بھی بڑھ کر وہ نیک اور پارسا بن جائے۔آخر کار وہ مذہب کے سانچے میں پوری طرح ڈھل جاتا ہے۔اب اس کے ذہن پر ایک نیا نقشہ اُبھر تا ہے۔اور وہ ہے" کلام الٰہی سے آفات سماوی پر قابو پانا"۔جب بھی وہ شہر جاتا ہے تو واپسی پر عملیاتِ روحانی کی ایک آدھ کتاب ضرور لاتا ہے۔لیکن جب اس کا کوئی تعویذ یا دم کارگر ثابت نہیں ہوتا۔تو وہ اس بے اثری سے حیران اور پریشان رہتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟لیکن جب وہ نانی اماں سے سنتا ہے کہ مرشد کامل کے بغیر کرامات حاصل نہیں ہو سکتیں۔تو نوروز "ملنگ بابا کاغانی□' اور "پیر بابا□' کے در پر حاضر ہو جاتا ہے۔اس کے بعد وہ پیر بابا □ کی برکت سے مختلف بیماریوں کا تعویذ اور گنڈوں سے علاج کرتا ہے۔بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مریض اتفاقاً صحت یاب بھی ہو جاتا ہے اس لیے وہ بہت جلد لوگوں میں مشہور ہو جاتا ہے۔نوروز کا شہر میں ایک دوست ہوتا ہے۔اس کا بڑا بیٹا ربانی کالج سے فارغ ہو کر آرام کی خاطر مہینہ بھر سے نوروز کے ہاں مقیم ہو جاتا ہے۔وہ سائنس کا طالب العلم ہوتا ہے اس لیے ایک طرف سائنس کی حقیقت پسندی اور دوسری طرف نوروز کے روحانی کمالات کے اثرات کا حامل ذہن ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ نوروز اور ربانی کے ذہن اپنے اپنے ماحول کے تحت آپس میں لگا نہیں کھاتے۔دونوں اپنا اپنا راگ آلاپتے ہیں لیکن ایک دوسرے کو قائل کرنے میں کامیاب نہیں رہتے۔ربانی نوروز کے توہمات کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔لیکن اکثر ایسا کوئی اتفاقی واقعہ پیش آجاتا ہے۔کہ نوروز کو پھر توہم میں ڈال دیتا تھا۔ایک روز زور کی آندھی آتی ہے جس سے نوروز کی خوبانیوں کے باغ کو نقصان پہنچنے کا خدشہ ہوتا ہے۔نوروز پیر بابا کی منت مان لیتا ہے اور اتفاقاً اسی وقت گرد و غبار ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے یوں طوفان بھی تھم جاتا ہے اور بارش بھی برسنا شروع ہو جاتی ہے۔اور بقولِ افسانہ نگار:

> "نوروز نے اپنے بھیگے ہوئے کُرتے کا دامن نچوڑتے ہوئے ربانی کی آنکھوں میں کچھ اس ادا سے آنکھیں ڈال دیں، جیسے کہہ رہا ہو۔"کیوں بیٹا ! دیکھ لیا نا پیر بابا کی دعاؤں کا اثر آندھی کا جگر پانی کر دیا ہے۔آندھی کا۔" اور یہی احساسِ فتحمندی تھا جس نے گھڑی بھر میں وہ تمام لہر مٹا دیئے تھے۔جو ربانی کے جوان خیالات نے نوروز کے توہم آلود عقیدوں کی سطح پہ بنا دیئے تھے۔نوروز کا ذہن کچھ دنوں سے گنڈے تعویذ اور منت مراد سے ہٹ کر محنت مشقت اور علم و عمل کے دریچے سے جھانکنے لگا تھا۔لیکن اس نئے واقعہ نے یہ دریچہ بھی کھٹ سے بند کر دیا۔" (7)

اس معاشرے میں یہ اور اسی قسم کی دوسری باتیں پیر بابا، ملنگ بابا، دیوانہ بابا اور دوسرے صاحب کشف و کرامات کے متعلق گھڑی جاتی ہیں۔توہمات اور بے جا اعتقادات اس دیہی معاشرت کا حصہ ہے۔پیر فقیر، جادو ٹونے اور تعویذ گنڈوں پر یقین ذہنی پستی اور جہالت کی نشانی کے طور پر افسانہ نگاروں نے اپنے تخلیقات میں اکثر و بیشتر بیان کئے ہیں۔

پیر فقیر اور مزارات پر منتیں مانگنے اور نذر و نیاز کا تذکرہ افسانہ "آرزوئیں اور فاصلے" میں کیا گیا ہے۔وہ مزارات جن کی حقیقت اکثر نامعلوم ہوتی ہے اور جو اکثر جرائم پیشہ اور منشیات فروشوں کا ڈیرہ ہوتا ہے وہاں پڑے فقیروں میں اکثریت نشیوں کی ہوتی ہے جو کہ صرف اپنے نشے کیلئے رقم اکٹھے کرنے ملنگ اور فقیر بنے ہوتے ہیں۔زائرین جن میں اکثریت عموماً خواتین کی ہوتی ہے ان فقیروں اور ملنگوں کو اپنے مرادیں پورے کرنے کیلئے نذر و نیاز کھانے پینے کے اشیاء یا نقد کی صورت میں دیتے ہیں۔اس افسانے کا ایک کردار سُلطانے جو چرس کے نشے کا عادی ہوتا ہے۔نشے کے پیسے نہ ہونے پر اپنا قمیص اتار کر مزار کو جاتے راستے میں لیٹ جاتا ہے۔غازی بابا کے زیارت کو آئے خواتین کا سلطانے کو پیسے دینے کا منظر افسانہ نگار نے کچھ یوں پیش کیا ہے:

> "سلطانے کی سوئی ہوئی آنکھیں کھل گئیں، چہرہ کھل آٹھا اس کے بے جان جسم میں کسی نے جیسے روح پھونک دی ہو۔اس کے دل میں اچانک ایک خیال گزرا اور ہونٹوں پر مسکان پھیل گئی چنانچہ جلدی سے اس نے اپنے آس پاس دیکھا اور جب دور دور تک اسے کوئی اور نظر نہ آیا تو اس نے عورتوں کے ہجوم کے قریب آنے سے پہلے اپنی قمیص اتاری اور غازی بابا کے مزار کے پاس زمین پر پھیلا دی پھر اس نے زیارت کے کچھ پھول اور پتھر لے کر وہ بھی قمیص پر پھیلا دیئے خود مسکین صورت بنا کر مراقبے کے عالم میں بیٹھ گیا۔" (8)

افسانہ نگار نے فنّی مہارت کا استعمال کرتے ہوئے دیہی معاشرت کے ان کرداروں اور ان کے نفسیات کو اُجاگر کیا ہے۔کس طرح خواتین اپنے مرادیں پوری کرنے کے لئے روپے پیسے کا بے دریغ استعمال اور ان پیر فقیروں کو مسیحا و مشکل کشا سمجھ بیٹھتی ہیں۔نسلِ نو کے بے راہ روی و تباہی میں جن منشیات فروشوں کا اہم کردار ہیں وہ زیادہ تر انہی مزارات کا استعمال کرکے فحاشی و منشیات فروشی کے اڈے چلاتے ہیں۔تعلیم کی کمی اور جہالت کی وجہ سے ملک بھر کے گوٹ اور دیہاتوں میں اور بلخصوص خیبر پختون خوا کے دیہی علاقاجات میں ضعیف الاعتقادی بہ کثرت پائی جاتی ہے۔احمد ندیم قاسمی نے شمالی پنجاب کے گوٹ اور دیہات میں اسی رجحان کو اپنے افسانوں میں بہ کثرت پیش کیا ہے۔افسانہ "دو قبریں" میں دریا کنارے پڑے دو نامعلوم نعشیں مقامی لوگوں کیلئے شہدا کا درجہ اختیار کر جاتی ہے۔ان کی ایک جھلک دیکھنے کیلئے جوق در جوق لوگ چلے آتے ہیں۔رات کو کھڑک کے ساتھ بارش کی وجہ بھی انہی دونوں کے مظلومیت سے جوڑا جاتا ہے۔اور پھر ان کے قبروں پر جھنڈیاں لگا کر "مسافر

بابا"اور "مسافر اماں کے ناموں سے مشہور ہو کر کے منتیں مانگنا شروع کر دیتے ہیں۔ عرس و لنگر کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔افسانہ نگار مزارات پر اعتقاد کے حوالے لکھتے ہے:

> "مسافر بابا" اور "مسافر اماں" کے زیارتوں پر بڑے بوڑھوں اور عورتوں کا جمگھٹا رہتا لوگ منتیں مانگنے اور مرادیں پوری کرنے دور دور سے آتے، لنگر تقسیم ہوتا۔اب تو گاؤں کے خان اور صاحب ثروت لوگ اپنے عشر اور رز کواۃ کی رقم بھی اسی لنگر میں دینے لگے، اور تو اور زیارتوں کے رکھوالے اور منجاور بھی پیدا ہو گئے۔یوں منشیات فروشوں اور جواریوں کے لیے ایک بہترین اڈہ ہاتھ آیا۔" (9)

افسانہ نگار نے جہالت کا شاخسانہ قرار دیتے ہوئے پشتون معاشرے میں سرایت کرتے منفی رویوں کو صحیح تناظر میں پیش کیا ہے اور مذہبی عقیدت مندی کے بات کو ہر صورت میں قبول و مقبول کرنے کی روایت کو بیان کیا ہے، کہ اس معاشرے میں ہر قسم کے معجزات پر آنکھ بند کر کے یقین کیا جاتا ہے۔اور اس قسم کی بات آن کی آن میں ہر سو پھیل جاتی ہے۔تصدیق کئے بنا پیر فقیر اور مزارات کی ہندوانہ پرستش اور مشکل کشا مانا جانے لگتا ہے۔

خیبر پختون خواکے دیہی ثقافت میں نظر لگنے اور لگانے کا عقیدہ بہت پرُانا ہے۔مرد وزن دونوں اس عقیدے کے قائل ہیں۔یہاں کے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں پشتون معاشرت کی اس توہم پرستانہ عقائد کو پیش کیا ہے اور یہاں کے باسیوں کے اس نفسیاتی اُلجھاو سے قاری کو باخبر کیا ہے۔افسانہ "دعائے مغفرت" میں عین شادی کے دن فوت ہو جانے والے دلبر خان کے جوانسال بیٹے کے میت پر اس کی والدہ سینہ کوبی کرتی ہوئے اپنے بیٹے کے موت کو نظر بد کا نتیجہ قرار دیتی ہے۔دہائی دیتے ہوئی کہتی ہے۔"ہائے میرے بیٹے کو کس ظالم کی نظر کھا گئی"۔ان دیہی علاقہ جات میں نظر بد اُتارنے کی بھی اپنے روایتی طریقے ہیں۔دم درود کے علاوہ کچھ جڑی بوٹوں کو مجمر میں انگاروں پر ڈال کر نظر بد کے شکار بندے کے گرد گھمایا جاتا ہے۔طاہر آفریدی نے اپنے افسانے "دیدن" میں پشتون ثقافت کے اُس دستور کا ذکر کیا ہے جس میں نظر بد کا شکار فرد کے سر سے سپیندکے پودے کو پھرایا جاتا ہے:

> "آج تو الماس نے اس طرح سنگھار کیا ہے لگتا ہے۔دلہن بن رہی ہے۔یا اپنے محبوب کو کسی جگہ بلایا ہو۔ایک عورت نے شرارتاً کہا۔اور الماس یوں اُچھلی جیسے بچھونے ڈنگ مار دیا ہو۔اتنے میں دوسری عورت نے جلدی کنوئیں کے پاس اُگی ہوئی سپند کی ہری بوٹی توڑ کر الماس کے سر سے تین دفعہ گھما کر اس کی نظر اُتار دی اور کہا۔"کتنا خوش نصیب ہو گا وہ جو تجھے دلہن بنائے گا"۔(10)

اس افسانے میں افسانہ نگار نے پشتون دیہات کے ایک اہم مقام پنگھٹ (گودر): جہاں گاؤں کے تمام لڑکیاں اور خواتین گھروں کو پانی لے جانے کے لیے جمع ہوتی ہیں۔کا منظر پیش کرتے ہوئے پشتون ثقافت کا نمونہ پیش کیا ہے۔جہاں سہیلیوں کے پیار و محبت، بناؤ سنگھار اور روایتی نظر بد اُتارنے کا انداز دکھایا ہے۔نظر لگنے لگانے کا عقیدہ دیہاتیوں میں اگرچہ بہت پُرانا ہے۔لیکن یہ پیار اور خلوص کے اظہار کا ایک انداز بھی ہے جو کبھی ماں کا بچوں کے نظر اُتارتے، ساس کا نئی نویلی دُلہن کا نظر اُتارتے یا بہن کی بھائی کا نظر اُتارتے دیکھا جا سکتا ہے۔طاہر نے یہاں سہیلیوں کے درمیان خلوص اور پیار کا مظاہرہ کرتے دکھایا ہے۔نظر بد لگ جانے اور اس سے وابسطہ توہمات یہاں کے دیہی معاشرت میں ایسی جڑ پکڑ چکے ہیں کہ یہاں کی لکھاریوں نے اس کو باقاعدہ اپنے تحاریر کا حصہ بنایا ہے۔

افسانہ "نظر بد" اسی موضوع پر لکھا گیا ہے۔اس افسانے میں ضابطہ خان کو ایک ماہر زمیندار کا کردار سونپا گیا ہے۔آج کے جدید سہولیات کے باوجود وہ بیلوں کا جوڑا رکھتا ہے اور اسی سے ہی کھیتوں میں ہل چلاتا ہے۔گاؤں کے لوگ ان کے اس محنت کو بہت سراہتے ہیں۔جب اس کی بیوی تک اڑوس پڑوس کی عورتوں کی حسد و رشک سے بھرپور باتیں پہنچتی ہیں تو ایک دن وہ ضابطہ خان سے کہتی ہے:

> "عمر خان کے ابو! دیکھو پورے گاؤں کی آنکھیں تمہارے قُلبے (بیلوں کے جوٹ) پر لگی ہوئی ہیں۔مزدوری کرو لیکن......کچھ کم کم۔کہ کسی کی نظر بد نہ لگے۔نظر بد سے تو پتھر ٹوٹ جاتے ہیں۔" ضابطہ خان نے جواب دیا۔"کم عقل۔یہ نظر کیا بلا ہے۔میں تو یہ بالکل ماننے کو تیار نہیں۔" بیوی نے فوراً کہا۔"اے ہے......یہ کیا کہتے ہو۔نظر تو لگتی ہے......" مجھے یہ بتاؤ کہ لوگ ٹریکٹروں کو کیوں نظر نہیں لگاتے؟ نظر کے لیے مجھ غریب کا قُلبہ رہ گیا ہے؟......"ابھی ضابطہ خان مزید کچھ کہنے والا تھا۔کہ بیوی نے اس کی بات اچک لی۔"تم تو سارا دن کھیت میں ہل چلاتے ہو۔لوگوں کی باتیں تو میں سنتی ہوں۔" ضابطہ خان نے یہ کہہ کر بات ختم کردی۔"لوگوں کے ہاتھ آزاد ہیں۔وہ نکڑے ہو جائیں۔مجھے نظر لگائیں۔میں نظر کو بالکل مانتا نہیں"۔(11)

ضابطہ خان اپنے بیٹی کا رشتہ اس کی مرضی کے خلاف کہیں طے کرا دیتا ہے جس پر وہ گھر چھوڑ کر کسی کے ساتھ بھاگ جاتی ہے اور پھر ہر وقت اس کی بیوی اس کو نظر بد لگ جانے کا طعنہ دیتی رہتی ہے۔افسانہ نگار نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اگرچہ یہ سب فطری باتیں ہوتی ہے۔اس میں نظر لگنے کی کوئی بات نہیں لیکن ضعیف الاعتقادی ہی کی وجہ سے ضابطہ خان بھی یہ ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ واقعی نظر لگ جانے ہی کے وجہ سے ہوا ہے۔ایسے بہت سارے اتفاقاً ہونے والے واقعات لاعلمی اور کم فہمی کے وجہ سے بے بنیاد عقائد کو پختہ کر دیتی ہے۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

بد دیانت اور عدم مساوات والا معاشرہ انسان کو ذہنی پسماندگی اور غیر فطری طریقوں سے حصول معاش پر مجبور کردیتا ہے۔ حقوق کی عدم دستیابی کے سبب پیر فقیر، جادوٹونے، توہم پرستی اور گیدڑ سنگھی جیسے تصورات جنم لیتے ہیں۔اور خواہشات کے عدم تکمیل پر دم درود، تعویذ گنڈو سے ہوتا ہوا پیر فقیر، آستانوں اور ملنگوں پر سے گزرتا یہ سفر "گیدڑ سنگھی" پر جاکر رکتا ہے۔جس کے بارے میں یہ مشہور کردیا گیا ہے کہ اس کے حصول پر سارے مرادیں بھر اور تمنائیں پوری ہوجاتی ہیں۔

فرید عرش نے اپنے افسانے "گیدڑ سنگھی' میں یہاں کی دیہی معاشرت کی اسی توہم کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔افسانے کا مرکزی کردار خلیفہ درزی پے درپے ناکامیوں ، معاشی بدحالی اور لاولدی سے مایوس ہوکر روایتی دم درود، تعویذ گنڈو اور مختلف درگاہوں پر حاضریاں لگانا شروع کردیتا ہے۔ لیکن نتیجہ ندارد ،وہی معاشی بدحالی اور بے چینی، دکان پر کوئی شاگرد، ملازم ٹکتا ہی نہیں۔گاؤں کے ایک سیانے کے مشورے پر اس نے گیدڑ سنگھی کے حصول کا ارادہ کیا۔اسے یقین ہوچلا کہ یہی ان کے تمام مشکلات کا حل ہے۔خدا خدا کرکے ایک سنیاسی سے اس کا حصول ممکن ہوا یوں اب وہ پھولے نہیں سما رہا تھا۔

"خلیفہ کا ہاتھ بار بار جیب کوٹٹولتا ہے۔دوستوں کے خوش گپیوں میں وہ بظاہر شامل لیکن اس کا دیہان سہانے مستقبل، بچے کے شرارتوں اور مقبول و معروف ٹیلرنگ شاپ پر ہوتا ہے۔اب اگر وہ خاک کو بھی چھولے گا تو وہ بھی سونا بن جائے گی۔"(12)

خلیفہ سہانے مستقبل کے خواب لیے گھر پہنچتا ہے تو بیوی گھر پر موجود نہیں ڈھونڈنے پر پتہ چلتا ہے۔کہ وہ ان کے ایک ملازم کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔افسانہ نگار نے اس معاشرتی المیے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہاں توہمات اور بے جا اعتقادات اس انتہا تک پہنچ چکے ہیں کہ اتنا تک نہیں سوچا جاتا کہ گیدڑ سنگھی بیچنے والے کی اپنی حالت کیا ہے۔ان بیوپاریوں کو خود ایک وقت کی روٹی نصیب نہیں ہوتی یہی حال ان نام نہاد نجومیوں کا بھی ہے، جو لوگوں کو ان کی مستقبل کی خبر دیتے ہیں، لیکن ستم ظریفی یہ کہ ان سب سے باخبر ہو کر بھی ان سے جاکر اپنے مستقبل کے حال معلوم کیے جاتے ہیں۔اور ان کے غلط پیشن گوئیوں پر یقین کرتے ہیں۔

حوالہ جات

1. راحت زاخیلی، بگڑے چہرے، مترجمہ عبدالکافی ادیب، ملت پبلشنگ کمپنی، چارسدہ، ۱۹۹۲ء، ص: ۲۵
2. زیتون بانو، زندہ دکھ، مترجمہ تاج سعید، مقبول اکیڈمی، انارکلی، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص: ۱۲۹
3. مشرف مبشر، برکھا کی بدلی، دستاویز مطبوعات، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص: ۱۳
4. ثروت وہاب، خواب جب ٹوٹتے ہیں، بلال پریس، بٹ خیلہ، ملاکنڈ ایجنسی، ۲۰۰۸ء، ص ۱۰
5. مفلس درانی، صرف شرفاء کے لیے، مترجمہ قیوم مروت، گلشن ادب پبلی کیشنز، سنت نگر، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص: ۵۵
6. رضا ہمدانی، اٹک کے اس پار، گوشہ ادب، لاہور، ۱۹۵۴، ص: ۲۹۵
7. قتیل شفائی، خوبانیاں (افسانہ) مشمولہ: اٹک کے اس پار، رضا ہمدانی/فارغ بخاری (مرتبین)، گوشہ ادب، لاہور، ۱۹۵۴، ص: ۲۷۲
8. ارباب رشید احمد، آرزوئیں اور فاصلے، دھڑکنیں، مترجمہ تاج سعید، مکتبہ ارژنگ پشاور، ۱۹۸۸ء، ص: ۱۴۰
9. لطیف وہمی، پشتو زبان کے بہترین افسانے، مترجمہ علی کمیل قزلباش، کلاسیک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص: ۱۰۹
10. طاہر آفریدی، دیدن، بختیار اکیڈمی، کراچی، نومبر دسمبر ۱۹۸۲ء، ص: ۳۶
11. یوسف زئی، مشتاق مجروح، صرف شرفاء کے لیے، مترجمہ قیوم مروت، گلشن ادب پبلی کیشنز، سنتنگر، لاہور۔۱۹۹۷ء، ص: ۸۴
12. فرید عرش، گیدڑ سنگھی، (افسانہ) مطبوعہ: ماہنامہ شاداب، پشاور، ۳۱ مارچ ۱۹۶۳ء، ص: ۱۵